جی جی جی

"ایک بار دیکھا۔ دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔"

یہ ہوس آرائشِ محفل، کے کسی کردار کو ہو گی یا اختر شیرانی کو ہو سکتی ہے۔ جنہوں نے اس موضوع پر ایک بڑی خوبصورت نظم کہہ دی تھی۔ مگر مجھے ایسی کوئی ہوس نہیں ہے لیکن ذرا ٹھہریئے۔ مجھے یوں کہنا چاہیئے کہ مجھے اس شخص کو ایسی حالت میں دوبارہ دیکھنے کی ہوس نہیں ہے۔

وہ جب کمرے میں آیا تو میں نے اسے دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔

میں نے اسے دوسری مرتبہ دیکھا اور سوچ میں پڑ گیا۔

اور جس وقت اسے تیسری بار دیکھا تو گھبرا گیا۔

یہ سارا عمل منٹ ڈیڑھ منٹ میں جاری رہ کر ختم بھی ہو گیا۔

وہ کمرے میں آیا بھی تو عجیب انداز سے تھا۔ جیسے ایک لڑکا اسکول سے اپنے پاس ہونے کی خوشخبری لے کر بھاگا بھاگا گھر آیا ہو یا کوئی بیٹسمین میچ میں پوری سنچری بنا کر واپس پویلین میں پہنچا ہو۔ آنکھیں چمکتی ہوئی اور رخسار تمتماتے ہوئے۔

میری نظریں اسے قبول نہ کر سکیں میری نظر ہی کیا کسی کی نظریں بھی اسے قبول کرنے کو تیار نہیں تھیں ہر ایک کی دلی کیفیت مجھ جیسی تھی سوائے راجندر سنگھ بیدی کے جو کمرے کے صدر دروازے کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔

یہ واقعہ ہے اس دور کا جب میں قیام پاکستان سے پیشتر آل انڈیا ریڈیو سے بطور

سٹاف آرٹسٹ کے وابستہ تھا اور یہ کمرہ تھا شملہ پہاڑی کے سامنے ریڈیو اسٹیشن کی پرانی عمارت میں سیڑھیوں سے اوپر بائیں جانب، صحن کے بالمقابل۔

جو بھی کمرے میں آتا تھا اسے دیکھ کر ایک سوالیہ نشان بن جاتا تھا۔ کوئی کچھ کہتا بھی نہیں تھا اور کمرہ تھا کہ لوگوں سے نہیں، سوالیہ نشانوں سے بھر گیا تھا۔ میں کمرے سے کب باہر آیا، مجھے معلوم نہیں۔ شاید اس لمحے میں جب میں نے اسے تیسری بار دیکھا تھا۔

"دیکھا؟" بیدی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیکھا!" میں نے بھی اسی انداز میں کہا۔

ریڈیو اسٹیشن کی فضا میں ہر طرف آوازیں گونج رہی تھیں اور یہ آوازیں کہہ رہی تھیں "دیکھا۔ دکھاؤ تو۔ آؤ دیکھو"

اِن آوازوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اور وہ مسلسل مسکرائے جا رہا تھا۔

دوسرے دن شام کے وقت میں حلقہ اربابِ ذوق کے ہفت روزہ اجلاس میں چلا گیا۔

قیوم نظر نے اپنے بلند اور بھرپور قہقہے سے اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا۔ اور ابھی اس قہقہے کا ارتعاشِ آخری فضا میں لرز ہی رہا تھا کہ وہ کرسی سے اٹھ بیٹھے۔

"جنابِ والا! آج ہمارے حلقے میں ایک نئے صاحب آئے ہیں۔ مگر جنابِ والا مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ اس کا فیصلہ آپ کریں گے کہ یہ نئے صاحب ہیں یا پرانے؟"

حاضرین کی نظریں ایک دم اٹھیں ـــــ اٹھیں اور اس کے چہرے کو دیکھنے لگیں جسے میں ایک روز پہلے ریڈیو اسٹیشن کے ایک کمرے میں دیکھ چکا تھا۔

"کون؟"

"بتاؤ تو کون؟"

"میں ـــ یہ ـــ نہیں نہیں"

اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی اور اس کے گالوں میں سُرخی تھی۔

کوئی اور ہوتا تو اتنی نظروں کے ناگہانی حملے سے پریشان ہو جاتا، مگر وہ تو برابر

مسکرا رہا تھا۔

"میرے پیارے دوستو اور بہنو! میں دیویندر ستیارتھی کا چھوٹا بھائی ہوں۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیویندر ستیارتھی کا چھوٹا بھائی — اس کے ڈاڑھی کیوں نہیں؟"

"پاگل ہو گئے ہو — یہ وہی ہے۔"

"پاگل تم ہو گئے ہو — اس نے کہا نہیں میں دیویندر ستیارتھی کا چھوٹا بھائی ہوں۔"

"ارے یہ خود ہے۔"

نہیں — ہرگز نہیں۔ اس نے خود کہا ہے میں —"

"بکو نہیں۔"

بکتے تم ہو — وہ خود کہہ رہا ہے — دیویندر ستیارتھی کی ڈاڑھی تو تمہارے قد جتنی ہے۔"

ٹھہرو میں پوچھتا ہوں۔ لے۔ جناب! آپ ان کے چھوٹے بھائی ہیں نا۔"

قیوم نظر جو اب تک بڑے مزے سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے اپنی کرسی سے اُٹھ بیٹھے۔

"جناب والا! یہ دیویندر ستیارتھی خود ہیں۔"

"تو ان کی ڈاڑھی۔؟"

"اس کا جواب میں نہیں دے سکتا۔ آپ ان سے خود پوچھ لیں، مگر اس وقت نہیں۔ اب حلقے کی کاروائی کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔"

کاروائی ہوتی رہی — اور نگاہیں بار بار اس چہرے کو دیکھ رہی تھیں جو اپنے سب سے بڑے اثاثے کو کھو چکا تھا۔ اس شخص کی مثال ایک ایسے مسافر سے کچھ مختلف نہیں تھی جو کسی غیر ملک میں پہنچا ہو اور اس کی جیب میں پاسپورٹ ہی موجود نہ ہو۔ ایسے مسافر کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے کتنے اندیشے اس کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔ اور دیویندر ستیارتھی کی لمبی ڈاڑھی اس کا پاسپورٹ ہی تو تھی۔ یہ پاسپورٹ اس کے اپنے ملک میں بہت کام آتا تھا۔ یہ پاسپورٹ دیکھ کر کہنے والے کہتے ہیں یہ ہے دیویندر ستیارتھی۔

اور دیوندر ستیارتھی اپنا پاسپورٹ کھو بیٹھا تھا!

دنیا میں ہر شخص کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ اور دیوندر ستیارتھی کی شخصیت اس کی یہ لمبی ڈاڑھی تھی۔ جیسے ہی اس کا خیال آتا تھا، ذہن میں ایک لمبی ڈاڑھی لہرا جاتی تھی۔ اس لمبی ڈاڑھی کے بغیر دیوندر ستیارتھی کا کوئی امیج قائم ہی نہیں رہ سکتا تھا۔

ہم جب بھی کسی کا کوئی امیج بناتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا یہ امیج اس کی سب سے نمایاں شخصی خصوصیت کی بھرپور نمائندگی کرتا ہو، ورنہ امیج قائم ہی نہیں ہوسکتا۔ یہاں تک تو معاملہ بالکل ٹھیک ہے۔ امیج قائم کیا جاتا ہے۔ اور کیا جانا چاہیئے کہ ہم اس امیج کو برقرار رکھنے پر بھی اصرار کرنے لگیں۔ اگر کوئی شخص اپنا امیج خود توڑ پھوڑ ڈالتا ہے تو اس میں حرج کی بات کیا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کا خود ذمے دار ہے۔ اسے یہ حق حاصل ہے کہ جب چاہے اپنی شخصیت کو بدل دے۔ اپنے امیج میں ترمیم کرلے، لیکن ہم اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

تو اس نے اپنا امیج توڑ ڈالا تھا۔ مگر کیا مجال جو اس کے چہرے پر خفت اور پریشانی کا ذرہ برابر بھی اثر ہو۔ حلقۂ اربابِ ذوق میں بڑے ذوق و شوق سے جاتا تھا۔ ریڈیو میں آکر مائیک کے سامنے بیٹھ کر اپنا تازہ افسانہ پڑھتا تھا۔ اور پھر یہی افسانہ ادبی دنیا یا ادبِ لطیف کے دفتر میں لے آتا تھا۔ کوئی اسے ذرا غور سے دیکھتا تو وہ خود ہی کہہ دیتا۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں آپ کا دیوندر ستیارتھی ہوں جی!"

وہ اسی طرح بے تکلفی سے، بے فکری سے اطمینان کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا، جیسے کوئی خاص واقعہ ہوا ہی نہیں۔ جیسے وہ چیز جو اس کی پوری شخصیت بن چکی تھی۔ اس نے اسے اتار کر اپنی جیب میں رکھ لیا ہے کہ جب لوگوں کو اچھی طرح پریشان کرلے گا تو ایک دن جیب میں ہاتھ ڈالے گا اور پھر اسے اپنی ٹھوڑی پر چسپاں کرلے گا۔

اور ہوا یوں بھی اس کی شخصیت پھر اس کے چہرے پر آکر سج گئی۔

آج میں سوچتا ہوں تو یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ چیز جسے ہزاروں

دنوں اور ہزاروں راتوں نے اپنے ایک ایک لمحے کا خون دے کر سنوارا تھا جو زمین سے پھوٹنے والے پودے کی طرح آہستہ آہستہ بڑھی تھی، جب ایک مرتبہ نائی کی قینچی کی زد میں آکر اس کے چہرے سے اپنا رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم کر چکی تو پھر اتنی جلدی واپس کیسے آ گئی؟

کچھ یوں لگتا ہے جیسے سپنج پانی کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اور جس وقت اسے دبایا جاتا ہے، پانی کے سارے قطرے باہر آجاتے ہیں۔ دیوندر ستیارتھی نے بھی اپنی ڈاڑھی کو کٹوایا نہیں تھا، بلکہ کسی خاص کاریگری سے اپنی ٹھوڑی کے اندر چھپا لیا تھا۔ اور جب اس کا جی چاہا کہ اسے باہر نکال دے تو اسے فی الفور باہر لے آیا۔

کتنا بڑا کاریگر تھا یہ آدمی۔ یہ دیوندر ستیارتھی۔

میں نے اسے بڑا کاریگر کہا ہے۔ اور ٹھیک ہی کہا ہے۔ کاریگر میں ہنرمند کے معنی میں استعمال کرتا ہوں۔ آدمی کا ہنرمند ہونا معمولی بات نہیں۔ بہت بڑی بات ہے، ہر شخص ہنرمند نہیں ہو سکتا۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

مجھے کہنا یہ ہے کہ فرہاد نے بیستوں تراشا تو دودھ کی نہر بہادی اور دیوندر ستیارتھی نے ڈاڑھی ہٹائی تو ایک شفاف، چمکتا دمکتا ہوا ——— سرخ و سفید چہرہ نکل آیا وہ دیوندر ستیارتھی ہی تو تھا، مگر دیکھنے والے اسے دیوندر ستیارتھی کہنے پر تیار ہی نہیں ہوتے تھے، وہ اسے ایک جوانِ رعنا ماننے پر تو تیار تھے، لیکن دیوندر ستیارتھی ہرگز نہیں! خیر یہ حادثہ اس دور کا ہے جب دیوندر ستیارتھی کے چہرے سے اس کی ڈاڑھی غائب ہو گئی تھی، مگر جب پھر آموجود ہوئی تو وہ دیوندر ستیارتھی کا دیوندر ستیارتھی ہو گیا۔

کنہیا لال کپور اور کچھ ہوں تو ہوں کنھیا ہرگز نہیں۔ انہیں پہلی مرتبہ دیکھا جائے تو لگتا ہے کہ ابھی ابھی کسی ہسپتال میں سے نکل کر آتے ہیں۔ شکل و صورت سے ایک ایسی کتاب نظر آتے ہیں جس کی جلد پھٹ گئی ہو، اوراق بوسیدہ ہو گئے ہوں اور کتابت و طباعت بدنما ہو چکی ہو، مگر جب اس کتاب کو پڑھا جائے تو اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ

یہ تو انتہائی دلچسپ، راتوں کو نیند حرام کر دینے والی کتاب ہے۔ اگر ان کی مزاح نگاری کو رادھا تصور کر لیا جائے تو پھر یوں سمجھ لیجئے کہ یہ رادھا ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر نہیں، بلکہ ان کے آگے آگے چلی جا رہی ہے اور یہ سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھا رہے ہیں۔

کپور، خدا کی بڑی صابر و شاکر مخلوق میں سے ہیں۔ اللہ نے انہیں ایک مرتبہ جو ظاہری شکل و صورت دے دی، اس میں انہوں نے قطعی طور پر کوئی ترمیم نہیں کی۔ میرا خیال ہے آج بھی وہ ویسے کے ویسے نحیف و نزار، منحنی، ایسے تر ونگے نظر آتے ہوں گے جیسے وہ ستائیس اٹھائیس برس پہلے دکھائی دیتے تھے۔ اوپندر ناتھ اشک انہیں "بانس کپور" کہتے تھے، مگر ان کے سامنے نہیں۔ اشک، کپور کی فقرہ بازی سے ہمیشہ دہشت زدہ رہتے تھے۔

ایک روز میں نے کپور سے کہا، "کپور صاحب! اگر آپ نے بھی مکھن کھایا ہوتا تو آج آپ کی یہ حالت نہ ہوتی۔"

"ابے کھایا تھا اور سیروں کے حساب سے کھایا تھا۔"

"تو وہ کہاں گیا مکھن!" میں نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں یار! جتنا کھایا تھا اس سے دوگنا اس نے نکلوا لیا۔"

"بڑی ظالم تھی آپ کی رادھا۔"

"نہیں وہ ظالم نہیں تھی۔ ظالم میں تھا۔ مجھے مکھن ہضم نہ ہو سکا۔ ویسے دنیا میں بھی ایک اور ہستی کو بھی گھی ہضم نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں ہم دونوں برابر ہیں۔"

کپور کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ شعر کو شعر کی طرح پڑھ ہی نہیں سکتے تھے۔ نثر بنا کر رکھ دیتے تھے۔ شعر فہمی میں ان کا جواب نہیں تھا، مگر شعر کو صحیح طور پر پڑھنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ ایک بار انہوں نے شعر گوئی کا بھی ثبوت دے دیا تھا۔ ایک مضمون میں مرزا غالب کو اردو کے جدید شعرا کی محفل میں لے آئے تھے۔ نہایت خوبصورت مضمون ہے۔ اس میں کپور نے جو شعر لکھے ہیں ان کی نوک پلک قیوم نظر نے سنواری تھی۔ تو ایک روز کرنا خدا کا یہ ہوا کہ کپور ادب لطیف کے دفتر میں آ گئے۔ اتفاق سے

اس وقت دفتر میں ایک خاتون افسانہ نگار بھی بیٹھی تھیں۔ یہ خاتون افسانہ نگار اپنی شادی سے پیشتر افسانے پیدا کرتی تھی۔ شادی ہو گئی تو افسانوں کے بجائے بچوں کی تولید میں اس طرح مصروف ہو گئیں کہ افسانے کی طرف پھر نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

تو اس دن کنہیا لال کپور آئے اور آتے ہی کہنے لگے۔

"تمہارے لیے ایک خاص چیز لایا ہوں!"

"میٹھی ہے کیا؟"

کھاؤ گے تو سویوں کا مزہ آئے گا۔"

"نکالیے کپور صاحب!"

"یہ چیز نکالی نہیں جائے گی۔ نازل ہو گی۔" اور وہ چیز نازل ہو گئی۔

اس چیز کو دیکھ کر پتہ چل گیا کہ کپور کی سویوں سے کیا مراد تھی۔

میں نے اسے دیکھا۔ طریقہ یہی ہے کہ پہلے آدمی پیدا ہوتا ہے پھر وہ ایک خاص عمر میں اپنی ڈاڑھی بڑھانے لگتا ہے اور اس کی ایک حد مقرر کر دیتا ہے، لیکن جس شخص کو میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے بارے میں یہ کلیہ غلط معلوم ہوتا تھا۔ احساس یہ ہوتا تھا کہ پیدا کرنے والے نے بس ایک خوفناک حد تک لمبی ڈاڑھی پیدا کی تھی۔ اس کے ارد گرد جو گوشت پوست وغیرہ نظر آتا ہے وہ خالقِ حقیقی اور اس شخص کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔

"یہ کون ہیں بھلا؟" کپور نے پوچھا۔

"دیویندر ستیارتھی تو نہیں؟" میں نے جواب دیا۔ کئی بار اس کی تصویر دیکھ چکا تھا۔

"جی آپ نے مجھے پہچان لیا جی!" یوں آواز آئی جیسے ہونٹوں میں سے نکل کر ڈاڑھی کا طویل سفر طے کر کے، تھک ٹوٹ کر میرے کانوں تک پہنچی ہے۔ "ستیارتھی صاحب، آپ کو کون نہیں پہچان سکتا۔"

ستیارتھی صاحب ابھی تک کھڑے تھے۔

تشریف رکھیے نا ستیارتھی صاحب۔"

"جی بیٹھتا ہوں جی۔" ستیارتھی صاحب دو تین لمحے کھڑے رہے، کرسیوں کا جائزہ لیتے رہے پھر خاتون افسانہ نگار کے ساتھ والی کرسی پر براجمان ہو گئے۔

"جی آداب۔"

ستیارتھی صاحب نے بڑی لجاجت سے خاتون کو مخاطب کیا تھا، مگر خاتون نے آہستہ سے ہونٹ ہلاتے اور وہاں سے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا۔

ستیارتھی صاحب کے چہرے کے اثرات بتا رہے تھے کہ انہیں خاتون کے چلے جانے کا بہت افسوس ہے۔

میں نے دیکھا کپور مسکرا رہے تھے۔

"ستیارتھی جی! آپ بڑے خوبصورت افسانے لکھتے ہیں" میں نے کوشش کی کہ ستیارتھی صاحب کی اندرونی کیفیت بدل جائے۔

"جی میں افسانے نہیں لکھتا۔ افسانے مجھے لکھتے ہیں۔ جی" ستیارتھی صاحب نے اپنی طرف سے ایک سنسنی خیز خبر سنائی۔

"ستیارتھی! اب اس فقرے کا ترجمہ بھی کر دو۔" کپور نے کہا۔

اس کے جواب میں ستیارتھی صاحب ہنس پڑے۔

"جی وہ کون ہیں؟" ستیارتھی صاحب نے منہ میرے قریب لا کر کہا۔

"تم نے اسے بھگا دیا ہے۔ اور اب اس کا اتا پتا پوچھ رہے ہو، بے وقوف کہیں کے۔" یہ الفاظ کنہیا لال کپور کے تھے۔

"جی میں نے اسے نہیں بھگایا، وہ تو بڑی اچھی بی بی ہیں جی!"

"تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ وہ بڑی اچھی بی بی ہے۔"

"دنیا میں سب بیبیاں اچھی ہوتی ہیں۔ جی میں بھی افسانہ نگار ہوں اور وہ بھی کچھ ہوں گی۔ آخر آپ کے پاس آئیں کیوں! جی میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا جی!"

"آپ نے کبھی غلط بات بھی کہی ہے ستیارتھی مہاراج!" کپور صاحب بولے۔

ستیارتھی ہنس پڑے۔ ان کی ہنسی۔ لگتا تھا کسی قدر فاصلے پر شیشے کے دو گلاس آپس

میں ٹکرا گئے ہوں۔

اس دن دیویندر ستیارتھی صاحب پہلی مرتبہ ادبِ لطیف کے دفتر میں آئے تھے اور جب گئے تھے تو آہستہ سے میرے دل کو بھی چھو گئے تھے، مگر صرف میرے دل کو نہیں کئی اور دلوں کو بھی اور اس بات کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب چند روز بعد ایک بوڑھی عورت میرے پاس آئی۔ سیڑھیاں طے کرنے کی وجہ سے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ میرے پاس آکر وہ کھانسنے لگی اور اس کا ہاتھ ہوا میں اس طرح لہرانے لگا جیسے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کچھ نہیں کہہ سکتی۔ جب اس کی سانس بحال ہوئی تو وہ بولی۔

"بابا جی۔ آئے!"

"کون بابا جی!" میں نے پوچھا۔

"وہ جو۔ بابا جی ہیں۔ اس دن آئے تھے نا آپ کے پاس۔"

میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگی گویا کہہ رہی ہو۔ عجیب آدمی ہیں آپ بھی۔ آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ بابا جی کون ہیں! میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے بڑھیا سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ستیارتھی جی کو پوچھتی ہو۔"

اتنا مشکل نام اس کی زبان سے کیونکر ادا ہو سکتا تھا۔ کہنے لگی "بڑا اوکھا نام ہے بابا جی کا"

"اماں جی! وہ جب آئیں گے تو میں ان سے کہہ دوں گا" میں نے اس سے نجات پانے کے خیال سے کہا۔

"آج نہیں آئیں گے۔"

"پتہ جی"

"میں تمہاری ہمسائی ہوں بیٹا۔ میرا پتر جو ہے دینا کو جوان ہے۔ ادھر پریس ہے نا اس کے سامنے جو گلی ہے ہم اس کے سامنے رہتے ہیں۔"

"میں کہہ دوں گا بابا جی سے" مگر بابا جی سے کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ چار پانچ

روز بعد بڑھیا آ گئی - ہاتھ میں ایک پلیٹ لئے ہوئے - پلیٹ ایک میلے سے رومال کے ساتھ ڈھکی ہوئی تھی -

"یہ کیا ہے اماں ؟"

"بابا جی کے لیے ہے انہوں نے دعا مانگی تھی - میری بہو ٹھیک ہو گئی ہے - آج اس نے کھیر پکائی ہے - بابا جی کے لیے لائی ہوں " میرے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا لیکن میری آنکھوں نے اس سے ضرور کوئی ایسی بات کہہ دی ہو گی ، جو وہ سمجھ نہیں سکی ہو گی - میرے دل میں خیال آیا تھا : اماں ! وہ مسلمان تو نہیں ہے -

وہ مسلمان ہے یا نہیں - اس سے بڑھیا کو کیا واسطہ - اسے تو ایک بزرگ ملا تھا - اس کے لیے یہی بات کافی تھی - اس بزرگ نے اس کی بہو کے لیے دعا کی ہو گی - اور اب وہ یہ جتانے کے لیے آئی تھی کہ وہ اس کی ممنون ہے -

" اماں جی ! پتہ نہیں کب آئیں - آپ کھیر لے جائیں "

"نہیں پُتر - یہ بابا جی کے لیے ہے "

میں نے بڑا اصرار کیا تو وہ پلیٹ لے گئی ، مگر یہ کہہ گئی " وہ جب آئیں گے میں پھر کھیر پکاؤں گی ان کے لیے - "

دو دن بعد ستیارتھی صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے سارا قصہ ان کے گوش گزار کر دیا - میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں چمکنے لگی ہیں - بڑی لجاجت سے بولے " جی - یہ تو ان لوگوں کا اپنا خلوص ہے - مجھے اپنے گھر لے گئی تھی - میں نے کہا تھا دعا کروں گا - یہ ان کا اپنا خلوص ہے جی - سزیوں میں بڑا خلوص اور پیار ہوتا ہے - اور میں اس خلوص اور پیار پر جان دیتا ہوں - ہیں جی - "

ستیارتھی خاموش ہو گئے - پھر بولے -

"جی وہ بی بی - افسانہ نگار بھی نہیں آئی - بڑی اچھی بی بی ہیں جی ! کیوں نہیں آئیں ؟"

دیویندر ستیارتھی بعض باتیں بڑی سنجیدگی سے کرتے تھے اور بعض غیر سنجیدگی کے عالم میں کہہ دیتے تھے ، مگر مشکل اس وقت پڑتی تھی جب یہ نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی

بات سنجیدگی سے کر رہے ہیں یا غیر سنجیدگی سے مثلاً خاتون افسانہ نگار کا ذکر وہ اس انداز سے کرتے تھے جیسے انہیں اس کی ذات سے دلچسپی تو قطعاً نہیں بس یونہی اس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔

اور ایک دن جب انہوں نے پھر سوال کیا۔ "وہ بی بی جی"

"جی ہاں بی بی جی۔ ملیں گے ان سے؟"

"اتفاق سے ملاقات ہو جاتے تو کوئی حرج نہیں۔ آخر دیکھنے نا لکھنے والوں کو ایک دوسرے سے ملتے رہنا چاہیئے۔ ہیں نا جی"

"بالکل جی۔ آج چلیں گا"

"جی کہاں!"

"ایک ضروری کام ہے۔"

ہمارا مختصر مکالمہ ختم ہو گیا اور ہم آدھ پون گھنٹے کے بعد ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں مجھے جی" ستیار تھی صاحب نے پوچھا۔

"ایک افسانہ نگار کے ہاں"

"تو وہ افسانہ نگار آنا کیوں نہیں!"

"آنا کیوں نہیں نہ کہیئے۔ پوچھیے آتی کیوں نہیں"

"اچھا جی"

ستیار تھی صاحب خوش ہو گئے۔ مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ افسانہ نگار خاتون کمرے میں نہ آئیں۔ ان کے چھوٹے بھائی نے بتایا کہ وہ اپنی ایک سہیلی کے ہاں چلی گئی ہیں۔

ہم کمرے میں بیٹھے تھے میز پر چائے کا سامان پڑا تھا اور میز کے سامنے ایک لڑکا بار بار حیرت سے ستیار تھی صاحب کو دیکھنے میں مشغول تھا۔ خوشگوار ماحول تھا۔ اس میں کسی قسم کی تکلیف دہ کیفیت محسوس نہیں ہوتی تھی، لیکن اس کے بعد یوں ہوا کہ ارد گرد سے قہقہے بلند ہونے لگے۔ یہ قہقہے دیواروں کے عقب سے آ رہے تھے اور مجھے پریشان کر رہے تھے یہ کون تھے قہقہے لگانے والے! ظاہر ہے افسانہ نگار خاتون کے گھر والے کمرے کا محاصرہ

سکے کھڑے تھے اور نہ جانے کیسے کیسے فقرے کس رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ ستیارتھی صاحب چائے کا کپ جلدی ختم کرکے اٹھ بیٹھیں اور ہم گھر سے باہر نکل جائیں۔ مگر ایک کپ ختم کرنے کے بعد جب ان کا ہاتھ چائے دانی سے ٹی کوزی ہٹانے لگا تو میں چپ رہ نہ سکا۔ عرض کیا۔

"ستیارتھی جی! جب کوئی خاتون اپنی سہیلی سے ملتی ہے تو گفتگو جلدی نہیں ختم ہوتی۔"

"کبھی کبھی ہو بھی جاتی ہے!"

مارے گئے۔ یہ صاحب تو رات تک اس خاتون کا انتظار کرنا چاہتے تھے جو ممکن ہے گھر ہی میں بیٹھی ہو اور قہقہہ بازی میں گھر والوں کا ساتھ دے رہی ہو۔

دوسرا کپ پی لیا گیا تو میں اس خطرے کے پیشِ نظر کہ ستیارتھی صاحب کا ہاتھ پھر چائے دانی کی طرف نہ بڑھ جائے فوراً کرسی سے اٹھ بیٹھا۔

"آیئے ستیارتھی جی!"

اب ستیارتھی صاحب کیا کر سکتے تھے! اٹھ بیٹھے اور ہم دونوں میزبان لڑکے کے ذریعے اہلِ خانہ کا شکریہ ادا کرکے رخصت ہو گئے۔ جب تک گلی سے باہر نہیں نکلے، قہقہے برابر ہمارا تعاقب کرتے رہے۔ "بہت اچھی بی بی ہے۔" ستیارتھی جی رومال سے منہ صاف کرتے ہوئے بولے۔

"کمال ہے ستیارتھی جی! وہ بی بی ہم سے ملی کب ہے!" میں نے پوچھا۔

"اس کے گھر والے کتنے اچھے ہیں۔ چائے مٹھائی۔ بسکٹ۔"

"مگر یہ تو اس کے گھر والے تھے۔ وہ خود تو نہیں تھی!"

"گھر والے اچھے ہیں۔ وہ خود بھی اچھی ہے۔"

دوسرے دن وہ خاتون افسانہ نگار دفتر میں آگئیں۔ میں نے ان کے چہرے پر نظر ڈالی تو احساس ہو گیا کہ طبعِ نازک پر یقیناً کوئی چیز گراں گزری ہے۔

"آپ بھلا انہیں کیوں میرے گھر لے گئے تھے؟" بڑی سخت شکایت تھی۔

"وہ بزرگ آدمی ہیں۔"

"ہوں گے، مگر ہر بزرگ میرے گھر میں کیوں آئے۔ آپ کو کیا پتا میرے گھر والے پوچھتے رہے، یہ کون ہے تمہاری ان سے کب ملاقات ہوئی۔ اور۔ اور۔"

"تم مجھے نہیں جانتیں، یا تمہارے گھر والے۔"

"آپ کی بات تھوڑی کر رہی ہوں۔ آپ کو تو سب جانتے ہیں۔ انکی بات کر رہی ہوں!"

"دیویندر ستیارتھی کی!"

"اور کس کی۔ بھلا میں کیا کہتی کہ ان سے کہاں ملی تھی؟"

"بہت اچھے آدمی ہیں۔"

"میں کب کہتی ہوں بُرے آدمی ہیں۔ پر دیکھئے نا۔ ہیں تو اجنبی نا ہمارے لئے۔"

خدا خدا کر کے ان کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ وہ جانے کی تیاری کر رہی تھیں کہ ستیارتھی جی آ گئے۔

میں انہیں دیکھ کر ایک الجھن سی محسوس کرنے لگا۔

ستیارتھی صاحب اس کے پاس والی کرسی میں بیٹھ گئے۔

"جی کل ہم آپ کے ہاں گئے تھے جی۔ آپ کے گھر والوں نے ہماری بڑی خاطر مدارات کی۔ میں ان کا بہت ممنون ہوں جی۔ کتنی اچھی ہیں آپ اور کتنے اچھے ہیں آپ کے گھر والے۔"

مجھے توقع تھی کہ خاتون کوئی تلخ جواب دے گی، مگر میرے کانوں نے جو کچھ سنا وہ میری توقع کے بالکل خلاف تھا۔

"ستیارتھی صاحب! مجھے بڑا افسوس ہے میں آپ سے مل نہ سکی۔ اب آپ کب آئیں گے جی؟"

"آپ جب کہیں۔"

"کل آیئے ضرور آیئے۔ میں انتظار کروں گی۔ دیکھئے مایوس نہ کیجئے۔" ستیارتھی جی کے چہرے کے کسی نہ معلوم گوشے سے مسکراہٹ کی لہریں اٹھیں اور داڑھی کے اندھیرے میں جگنوؤں کی طرح چمکنے لگیں۔

کیا دیویندر ستیارتھی میں کوئی شخصی کشش تھی۔ یا وہ صرف لجاجت سے دوسروں کا دل موہ لیتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں ان دونوں باتوں کو حقیقت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ستیارتھی صاحب اپنی صورت سے بزرگ نظر آتے تھے اور لوگ اسی بنا پر ان کی عزت کرتے تھے۔ بالخصوص تانگے والے ان سے بطورِ خاص متاثر تھے۔ یہ لوگ ان سے کرایہ نہیں لیتے تھے اور

بڑے ادب کے ساتھ ان سے پیش آتے تھے، مگر اس میں فقط ان کی ڈاڑھی ہی کا کمال نہیں تھا۔ ان کا چہرہ بھی پُرکشش تھا۔ آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جو دیکھنے والوں کے دلوں کی گہرائیوں تک پہنچ جاتی تھی۔ گفتگو وہ بڑے انکسار، بڑی لجاجت سے کرتے تھے۔ وہ دوسروں کے آگے بچھ بچھ جاتے تھے۔ ان کا مخالف بھی ایک بار تو ضرور ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ستیارتھی صاحب کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا بیگ رہتا تھا۔ اس بیگ میں دو تین کتابیں بھی ہوتی تھیں، لیکن بیشتر ان کے مسودات ہوتے تھے۔ ستیارتھی صاحب بڑے شوق سے اپنی تحریریں احباب کو سناتے تھے اور ان کے احباب اس وجہ سے ان کے قریب آتے ہوئے گھبراتے تھے کہ وہ قابو میں آ گئے تو ستیارتھی صاحب ایک دو افسانے سنائے بغیر ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ تجربہ کار لوگ تو شاذ و نادر ہی ان کے ہتھے چڑھتے تھے؛ البتہ کالجوں کے طالب علم انہیں اپنے ہوسٹل کے کمرے میں لے جا کر بڑی سعادت مندی سے ان کی تحریریں سنتے تھے۔ کرشن چندر، کنہیا لال کپور، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک اور ابوسعید قریشی ان کی اس عادت سے بہت گھبراتے تھے۔ ایک بار منٹو بھی ان کے دام میں گرفتار ہو گئے تھے، مگر منٹو تو ٹھہرے منٹو۔ انہوں نے اپنے اس تجربے کو بھی رائیگاں جانے نہیں دیا۔ اسی وقت ایک افسانہ لکھ دیا۔ اور اس افسانے کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔

ابوسعید قریشی دیوندر ستیارتھی صاحب سے بہت پریشان رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ وضعدار آدمی رہے ہیں۔ کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتے ستیارتھی صاحب بلا تکلف انہیں ایک ہی نشست میں تین تین چار چار کہانیاں سنا دیتے تھے اور وہ صبر کر کے خاموشی سے یہ کہانیاں سن لیتے تھے۔

ایک روز غالباً گوپال متل نے اطلاع دی کہ ستیارتھی صاحب اوپندر ناتھ اشک کے کمرے میں بے ہوش پائے گئے ہیں۔

یہ اطلاع ملی تو ہر طرف سے استفسار ہونے لگا کہ ستیارتھی صاحب بے ہوش ہو گئے، لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا واقعہ ہوا کیوں! اس دن یہ خبر نہ جانے کہاں سے کہاں تک جا پہنچی۔ ادبی حلقوں میں "یہ سنسنی خیز خبر" بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی۔

احباب اشک کو گھیر گھار کر دفتر ادب لطیف میں لے آئے کر پوچھیں ستیارتھی جی بے ہوش ہو گئے تھے یا یہ صرف ایک افواہ ہے اور حقیقت سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں!

اشک نے آنکھوں سے عینک اتاری، کُرتے کے دامن سے اسکے شیشے صاف کئے اور بولے:

"وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ صبح انہیں ہوش آیا۔"

"سچ!"

"تو اور کیا جھوٹ۔"

"بے ہوش کیوں کر ہو گئے!" کسی نے پوچھا۔

"اس کی وجہ صرف میں جانتا ہوں!" اشک نے اپنی اہمیت جتاتے ہوئے کہا۔

"بتایئے اشک صاحب!"

"مجھے کیا فائدہ پہنچے گا!" اشک نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کہیئے تو چائے کے ساتھ مٹھائی۔"

ابو سعید قریشی نے کہا جو یہ بات نہیں جانتے تھے کہ اشک جتنی فراخدلی اور کشادہ طبعی سے قہقہے لگاتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے پینے کے معاملے میں وہ اس فراخدلی اور ذہنی کشادگی کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

"چائے اور مٹھائی کو مارو جی گولی۔"

"پھر کیا کیا جائے!" قریشی نے پوچھا۔

"میرزا میری نئی کہانی کا پیشگی معاوضہ دلا دے۔"

"منظور!" ایک شور اٹھا اور احباب نے میرے لیے خواہ مخواہ ایک مسئلہ پیدا کر دیا۔

اشک نے حسبِ عادت ایک زوردار قہقہہ لگایا اور فرمانے لگے:

"میں نے ستیارتھی جی کا بڑے پیار سے سواگت کیا۔ پھر ان سے ان کی تین کہانیاں سنیں۔ اور وہ میرے صبر و استقلال پر بہت آنند ہوتے۔ جب وہ کہانیاں سُنا چکے تو میں نے الماری میں سے ایک مسودہ نکالا اور انہیں سنانے لگا۔

"اس میں بے ہوش ہونے کی کیا بات ہے اشک صاحب!"

میں انہیں اپنا مسودہ سناتا رہا۔ سناتا رہا۔ یہاں تک کہ سارا ناول سُنا دیا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔

"سنتے سنتے!"

"اور کیا!"

یہ واقعہ تازہ تازہ مشہور ہوا تھا اور ابو سعید قریشی نے ہم سب کو یقین دلایا تھا کہ وہ بھی ستیارتھی صاحب کو بے ہوش ہونے کا پورا پورا موقع دیں گے۔

سب منتظر تھے کہ دیکھیں غالب کے کس طرح پرزے اڑتے ہیں۔

کہانی اپنے کلائمکس پر اس وقت پہنچی جب سُنا گیا کہ ابو سعید قریشی انڈیا ٹی ہاؤس میں ستیارتھی صاحب کی کہانیاں سن رہے ہیں۔

"پھر کیا ہوا!" میں نے دوسرے دن ایک ایسے صاحب سے پوچھا جو 'موقع واردات' پر حاضر تھے۔

"ہونا کیا تھا۔ ستیارتھی جی نے بہت سی کہانیاں سنائیں۔ رات کو نو دس بجے انہوں نے بل ادا کیا اور چلے گئے!"

"بل کس نے ادا کیا۔"

"ابو سعید قریشی نے اور کس نے؟"

دوسرے دن علی الصبح قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی تو ان کی ذہنی کیفیت بتا رہی تھی کہ یا تو کچھ دیر پہلے بے ہوش ہو چکے ہیں یا عنقریب بیہوش ہونے والے ہیں۔

دیویندر ستیارتھی اور ان کا بوجھل بیگ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہو چکے تھے۔ ان کا بیگ دیکھ کر مجھے بے اختیار حضرت اغلب یاد آ جاتے تھے۔ لوگ حضرت اغلب کو بھول چکے ہیں۔ اور اگر کچھ پرانے لاہوریوں کو اب بھی وہ یاد ہیں تو انہیں اغلب کے ساتھ ان کا بیگ بھی یقیناً یاد ہو گا۔ جناب اغلب اچھے خاصے صحت مند آدمی تھے، ڈاڑھی چھدری ہوئی۔ ہمیشہ اچکن پہنتے تھے، سر پہ بالعموم جناح کیپ ہوتی تھی، اور ہاتھ میں ایک بڑا سا بیگ۔ میں بازار حکیماں کے قریب رہتا تھا اور وہ بازار حکیماں میں ڈپٹی

جلال دین کی حویلی کے قریب ایک مکان کی بالائی منزل کے اندر رہتے تھے۔ کم و بیش روز ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں سلام کرتا تھا تو سر کے اشارے سے جواب دے کر خراماں خراماں آگے نکل جاتے تھے۔ ہر بار ان سے اپنا تعارف کراتا تھا اور ہر بار وہ مجھ سے اجنبیوں ہی کی طرح ملتے تھے۔ میرے دل میں یہ حسرت ہی رہی کہ کبھی تو مجھے پہچان کر گفتگو کریں مگر ایسا کبھی نہ ہو سکا۔

اغلب صاحب کو یہ گمان غالب تھا کہ وہ غالب سے بڑے شاعر ہیں، چنانچہ اپنے تخلص میں بھی انہوں نے برملا اس امر کا اظہار کر دیا تھا۔ وہ ٹھہرے غالب اور یہ اغلب۔

میں نے کئی مرتبہ اغلب صاحب سے کہا، "جناب! ذرا اپنے بیگ کا دیدار تو کرائیے!" فرماتے "ر دیکھ نہیں رہے؟" عرض کرتا "اس کے اندر کیا ہے؟" اس کے جواب میں گرج کر کہتے "ہمارا کلام ہے اور کیا ہے؟"

اس بیگ میں ان کا کلام ہی محفوظ رہتا تھا، مگر وہ اپنے کلام کو بیگ میں محفوظ کرکے اٹھائے اٹھائے کیوں پھرتے تھے؟

اس کی ایک وجہ تھی اور واقعی قابلِ قبول وجہ تھی۔ سنا جاتا ہے کہ ان کے برادرِ اکبر بڑے نامور مرثیہ گو تھے۔ ان کے مرثیئے کوئی ظالم آدمی چرا کر لے گیا تھا اور وہ اس ڈر سے کہ کہیں ان کے ساتھ بھی یہ بے رحمانہ سلوک نہ ہو۔ وہ اپنے مسودات اپنے بیگ میں بند رکھتے تھے۔ گھر میں رہتے تو بیگ کو نظروں کے سامنے رکھتے اور جب باہر آتے بیگ کو اٹھا کر باہر لے آتے اور پھر لاہور کی سڑکیں ہوتیں اور ان کے پاؤں۔ معلوم نہیں کہاں کہاں جاتے تھے۔ میں انہیں سرکلر روڈ پر ہی دیکھا کرتا تھا۔

جب چلتے تھے تو دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتے تھے۔ شریر لڑکے ان کے پیچھے شور مچانا شروع کر دیتے تھے "تھیلے والا آیا اے۔ تھیلے والا آیا اے،" لیکن ان کی بے نیازی میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس وقت کوئی بزرگ ادھر آ جاتا اور لڑکوں کو جھڑک کر منتشر کر دیتا۔

ایک بار ادبِ لطیف کے دفتر میں بھی آئے تھے۔ میں موجود نہیں تھا۔ چودھری

نذیر احمد سے باتیں کر کے چلے گئے۔ جب میں آیا تو چودھری صاحب بُری طرح ہنس رہے تھے۔

میں نے پوچھا: "کیا ہوا چودھری صاحب!"

بولے: "حضرتِ اغلب تشریف لائے تھے۔ عید کارڈ کے لیے ایک قطعہ دے گئے ہیں۔"

"مکتبہ اب عید کارڈ چھاپے گا؟"

"سنیے تو۔" اور چودھری صاحب نے میز پر سے ایک کاغذ اٹھایا۔

اغلب صاحب کا یہ قطعہ جس عید کارڈ پر چھپے گا وہ سارے ہندوستان میں کم از کم پچاس لاکھ کی تعداد میں شائع ہو گا۔ ایک لاکھ کارڈ کے لیے ایک ہزار روپیہ رائلٹی ہو گی۔ اس حساب سے ان کی رائلٹی کی رقم پچاس ہزار ہونی چاہیئے۔"

"پچاس ہزار؟"

"جی ہاں، انہوں نے ہمارے ساتھ بڑی رعایت کی ہے۔ کہتے ہیں بھائی دروازے کے اندر رہتا ہوں اور آپ بھائی دروازہ کے باہر۔ اس لئے میں مروت سے کام لے رہا ہوں۔"

"بہت خوب!"

"نصف رقم وہ پیشگی مانگ رہے ہیں۔ یعنی پچیس ہزار۔ اور کل شام کو رقم وصول کرنے کے لیے تشریف لائیں گے!"

"انتظام کر لیجئے۔"

"میرزا صاحب! میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ رسالے اور کتابوں کے سلسلے میں سب اختیارات ہمارے ایڈیٹر کو حاصل ہیں۔"

"آپ نے مجھے پھنسا دیا۔"

شام کے وقت گھر جا رہا تھا کہ حضرت اغلب سے ملاقات ہو گئی۔ یقین تھا وہ مجھ سے رائلٹی کے بارے میں کچھ کہیں گے مگر وہ تو میرے قریب سے اس انداز میں گزر گئے جیسے انہوں نے مجھے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔

میں نے دفتر سے دو دن کی چھٹی لے لی۔ خبر نہیں چودھری صاحب نے اغلب صاحب سے کیا کہا اور کیا سُنا۔ مگر اغلب صاحب، پھر کبھی دفتر میں تشریف نہیں لائے۔

حضرت اغلب نے بیگ کے ساتھ دیرینہ رفاقت کی روایت کو آخر تک نبھایا، مگر خود ضعیف اور بہت کمزور ہو چکے تھے۔ بیگ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اس زمانے میں ایک شخص بیگ اٹھا کر ان کے آگے آگے چلتا تھا اور یہ اس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھائے چلے جاتے تھے۔

سنا گیا تھا کہ وہ اس شخص کو دن بھر کی مزدوری دیتے تھے اور اس سے صرف یہی کام لیتے تھے یعنی بیگ برداری کا کام۔

ان کے مرنے کے بعد یہ بیگ کہاں گیا۔ کون جانے ؟

تو اغلب صاحب اور دیوندر ستیارتھی کے بیگوں میں بڑی مشابہت تھی۔ دونوں اپنی عمر طبعی بسر کر کے جہانِ فانی سے کوچ کرنے کا بزبانِ حال اعلان کر چکے تھے، لیکن ان کے مالک ان کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔

اس دن کا واقعہ ہے کہ دیوندر ستیارتھی اپنے بیگ کے ساتھ وہاں موجود تھے! کہاں بھلا راجندر سنگھ بیدی کے ہاں۔ میز کے اوپر کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ بیگ کے پاس چائے کی پیالیوں سے خوشبودار بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ستیارتھی صاحب کچھ پریشان نظر آتے تھے اور بار بار میری طرف دیکھتے تھے۔ ان کی نظریں کہہ رہی تھیں:

"پیارے دوست! اب تم چلے جاؤ۔" میں ان کی نظروں کا مفہوم سمجھتا تھا لیکن ڈھیٹ پن سے کام لے رہا تھا۔

عجیب ماحول تھا۔ بیدی مسکرا رہا تھا۔ ستیارتھی جی گھبرا رہے تھے اور میں ان کی گھبراہٹ سے لذت اندوز ہو رہا تھا۔

بیدی نے ذرا سنجیدگی سے کہا:

"آپ نے منٹو کا تازہ افسانہ پڑھا ہے!"

بیدی کے اس فقرے سے میں نے سمجھ لیا کہ معاملہ کیا ہے اور اس وقت کس اہم مسئلے پر گفتگو ہونے والی ہے۔

ستیارتھی صاحب افسانہ سنانے کے مرض میں بُری طرح مبتلا تھے۔ انہیں جہاں کہیں بھی "سامعین" مل جاتے تھے، اپنے بیگ سے یکے بعد دیگرے افسانے نکالنے لگتے تھے۔ سننے والے بور

ہو جاتے تھے۔ لیکن ستیارتھی جی کی باریک آواز مسلسل گونجتی رہتی تھی۔

منٹو کو ایسا موقع خدا دے، اس نے ایک افسانہ لکھا جس کا پلاٹ کچھ اس قسم کا تھا کہ ایک صاحب کے ہاں ان کا ایک مہمان آتا ہے جو اپنے ساتھ بہت سارے افسانے بھی لے آتا ہے۔ شروع شروع میں تو میزبان بڑی دلچسپی سے دو تین افسانے سن لیتا ہے، مگر جب مہمان صبح، دوپہر، شام افسانے پر افسانہ سُنانے کی ٹھان لیتا ہے تو وہ سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ میزبان کی پریشانی کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی خوبصورت بیوی سے بھی گفتگو نہیں کر سکتا۔ میاں بیوی کو تنہائی کے لمحے نصیب ہی نہیں ہوتے۔ مہمان سائے کی طرح میزبان کے ساتھ لگا رہتا ہے، کسی وقت بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

اس افسانے میں منٹو نے ایک بڑا خوبصورت اور بلیغ فقرہ لکھا تھا۔ یہ فقرہ کچھ اس قسم کا تھا کہ میزبان کو جب ایک لمحے کے لیے اپنی بیوی سے ملنے کا موقع ملتا تو وہ جلدی سے اس کے ہونٹ اس طرح چوم لیتا جیسے خط کے ٹکٹ پر مہر لگا رہا ہو۔

یاد رہے کہ راجندر سنگھ بیدی لاہور کے جنرل پوسٹ آفس میں بطور ایک کلرک کے ملازم تھا اور وہ خطوں لفافوں پر مہر لگایا کرتا تھا۔

افسانے کا شائع ہونا تھا کہ سب کو معلوم ہو گیا کہ اس افسانے کے مرکزی کردار، کون ہیں اور منٹو نے یہ افسانہ کن دو شخصیتوں کے بارے میں لکھا ہے۔ ستیارتھی نے اپنے احباب سے کہہ دیا تھا کہ وہ جواباً منٹو پر افسانہ لکھیں گے۔ اور منٹو پر افسانہ ضرور لکھا گیا۔ اس افسانے کے مصنف ستیارتھی جی نہیں تھے راجندر سنگھ بیدی تھا اور یہ حقیقت مجھے اس دن معلوم ہوئی جب میں، بیدی اور ستیارتھی جی کے ساتھ بیدی کے کمرے میں چائے پی رہا تھا۔

تو یہ قصہ ہے منٹو کے ستیارتھی جی کے متعلق افسانہ لکھنے کا اور ستیارتھی جی کے پردے میں بیدی کے جواب دینے کا۔

بیدی کا افسانہ اچھا خاصا تھا، لیکن یہ اس کی "لائق" نہیں ہے۔ منٹو کے افسانے میں بڑی کاٹ تھی اور بیدی کا افسانہ بس معذرت خواہانہ انداز لئے ہوئے تھا۔

ستیارتھی جی نے اردو کو کچھ افسانے بھی دیئے ہیں۔ مولانا صلاح الدین مرحوم، ادبی دنیا

ہیں ستیارتھی جی کے ہر افسانے پر بڑا شاندار نوٹ لکھتے تھے اور ستیارتھی جی اپنے ہر دوست اور ملنے والے سے التزاماً پوچھتے تھے:

"آپ نے میری کہانی پر مولانا صلاح الدین احمد کا نوٹ پڑھا؟"

"جی نہیں پڑھا۔"

"ضرور پڑھئے جی۔ میں تو آپ کا داس ہوں ناجی۔ مولانا بڑے ہی اچھے منش ہیں۔"

ستیارتھی جی نے اچھے افسانے لکھے ہیں، لیکن ان کا ناقابلِ فراموش کارنامہ لوک گیتوں کی فراہمی ہے۔ میری نظروں میں ستیارتھی قابلِ صد احترام شخصیت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس بنا پر کہ انہوں نے لوک گیت جمع کرنے میں جس صبر و استقلال کا ثبوت دیا تھا وہ صرف انہی کی ذات سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ اندازہ کیجئے کہ ایک شخص اپنی بیوی اور ننھی بچی کو ساتھ لیے برصغیر کے گاؤں گاؤں میں گھوم رہا ہے اور موسم کی صعوبتیں برداشت کر کے ان لوگوں سے مقامی لوک گیت جمع کر رہا ہے جن کی وہ زبان بھی نہیں سمجھ سکتا۔ کتنی استقامت سے انہوں نے اس قسم کی مشکلات کا سامنا کیا ہو گا۔ اس اعتبار سے وہ بے مثال کردار کے مالک ہیں۔

ستیارتھی جی نے اپنی اس کوشش میں بڑے دکھ جھیلے تھے۔ انہیں لوک گیت جمع کرنے کی لگن تھی اور اس لگن میں انہوں نے اپنے دنوں کا آرام اور راتوں کی نیند بھی تج دی۔

ستیارتھی جی نے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے لوک گیت جمع کئے تھے اور اس موضوع پر دو کتابیں بھی شائع کی تھیں۔ ایک کتاب انگریزی زبان میں ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ MEET MY PEOPLE اور اردو میں جو کتاب لکھی ہے اس کا نام ہے۔ "گاتا جا بنجارے" قیام پاکستان کے بعد ستیارتھی جی سے صرف دو مرتبہ ملاقات ہوئی۔ پہلی مرتبہ اس وقت جب وہ لاہور آئے تھے اور یونیورسٹی اورنٹیل کالج کی ایک ادبی تنظیم نے انہیں اپنے ہاں مدعو کیا تھا۔

ستیارتھی جی تقریر کرنے کے لیے بڑی شان سے اٹھے، مگر صرف یہ بات کہہ سکے۔

"لاہور میں مجھے اس کوچوان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی جو مجھے بڑے ادب و احترام سے اپنے تانگے میں بٹھا لیا کرتا تھا۔ میں بھی ایک کوچوان ہوں یار دادب کے تانگے کی کوچوانی

کرتا ہوں ۔میرا گھوڑا مریل ہے ۔ جیسا میں خود ہوں جی ، مگر یہ گھوڑا رکتا نہیں ہے ، چلتا رہتا ہے جی ۔ ہے نا جی !" اور ادب کے تانگے کے اس کوچوان کو چند روز پیشتر امرتسر ٹیلیویژن کی اسکرین پر بھی دیکھا تھا ۔ ان کی ڈاڑھی اور لمبی ہو گئی تھی شاید میں نے ایسا محسوس کیا تھا ، اگر وہ اسکرین پر نہ ہوتے" مادی طور پر میرے سامنے ہوتے تو میں ان سے کہتا ۔

"ستیارتھی جی ! یاد ہے آپ کو وہ ڈاڑھی صاف کرانے والا قصہ ۔"

ستیارتھی جی ہنس پڑتے ۔

"پیارے دوست ! جیون کا تانگہ تو چلتا ہی رہتا کبھی ٹھنڈی سڑک پر اور کبھی گرد آلود راستوں پر ۔ انسان نئے نئے تجربے کرتا رہتا ہے ۔ وہ بھی ایک تجربہ تھا ۔ اب تو تانگہ اس منزل سے بہت آگے نکل گیا ہے ۔ اچھا جی ۔ آپ کیسے ہیں جی ۔ بیوی بچے کیسے ہیں جی !"